رومن لاؑ کے ماخذ ایک جاعزہ

مستشرقین کو مشرق اور خصوصیت سے اسلام کی کوئی خوبی ایک نظر نہیں بھاتی، اگر ہنر کو عیب بنانے میں کامیاب نہ ہوں تو کم از کم اتنا تو کرتے ہی ہیں کہ مسلمانوں اور عربوں کے کارناموں کا رشتہ کسی اور قوم اور خاص کر روم و یونان سے جوڑ دیتے ہیں تاکہ یہ مسلمانوں کے کھاتہ میں نہ رہ سکے، یہی کام ان حضرات نے فقہ کے بارے میں کیا اور اسلامی فقہ کو ''رومن قوانین'' سے ماخوذ و مستفاد اور قرآن و حدیث سے بے تعلق یا کم ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کیے گئے دعاوی پر ان سطور میں اسی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

تین بحث طلب نکات *:

اس کے لیے اوّل ہمیں یہ بات دیکھنی ہوگی کہ کیا امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے فقہاء اسلام نے احکام شریعت کے لیے جو مصادر مقرر کئے ہیں ان میں کسی اجنبی قانون کے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں؟ اور وہ کس حد تک کتاب و سنت سے متعلق یا غیر متعلق ہیں، دوسرے امام ابو حنیفہؒ و دیگر قدیم فقہاء تک رومن قوانین کی رسائی تاریخی قرائن کی روشنی میں ممکن ہے؟ تیسرے رومن قوانین اور فقہ اسلامی کا مسائل زندگی کے مختلف شعبوں میں موازنہ کرنا ہوگا کہ ان میں کس درجہ مطابقت اور ہم آہنگی ہے اور جن احکام میں مطابقت ہے اس کی بنیاد کتاب و سنت اور عقل عام کے تقاضے ہیں، یا رومی قوانین سے استفادہ۔ یہ تین نکات ہیں، جن کی روشنی میں بہ سہولت اس دعوے کو کہ فقہ اسلامی رومی قوانین سے مستفاد ہے، پرکھا جا سکتا ہے اور اسی ترتیب سے ہمیں اس مسئلہ پر گفتگو کرنی ہے۔

فقہ اسلامی کے مآخذ *:

فقہ اسلامی کے ماخذ کا ہم پہلے بھی ایک تحریر میں تفصیلی جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ فقہائے اسلام نے بنیادی طور پر قانون کے چار سر چشمے (Sourcess of Law) مقرر کئے، ان میں ترتیب اس طرح ہے کہ اوّل قرآن مجید کو پیشِ نظر رکھا جائے؛ پھر رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں سامنے رکھیں جائیں، اس کے بعد ان احکام کا درجہ ہے، جن پر امت کا اجماع واتفاق ہے، ظاہر ہے کہ امت کا کسی ایسی بات پر اتفاق ممکن نہیں جو قرآن وحدیث کی روح کے خلاف ہو، اس لیے اجماع بھی دراصل کتاب وسنت کے مزاج ومذاق کی اجماعی ترجمانی سے عبارت ہے، چوتھا درجہ ''قیاس'' کا ہے، قیاس یہ ہے کہ کتاب وسنت میں کسی مسئلہ میں جس سبب خاص کی بناء پر کوئی حکم لگایا گیا ہو، وہ سبب جہاں جہاں پایا جائے وہاں وہی حکم لگایا جائے، مثلاً حدیث میں کتے کے جھوٹے کو ناپاک قرار دیا گیا، حدیث سے بعض اور جانوروں کے جھوٹے کے متعلق بھی ایسا ہی حکم ملتا ہے، فقہاء نے غور کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس کی وجہ ان جانوروں کا ناپاک ہونا ہے لہذا فیصلہ کیا کہ تمام جانور جن کا گوشت ناپاک اور حرام ہے، ان کا جھوٹا بھی حرام اور ناپاک ہے اسی کا نام ''قیاس'' ہے۔ اسی طرح قیاس کی اصل غایت کتاب وسنت کے احکام کے دائرہ کو وسیع اور ان صورتوں تک متعدی کرنا ہے، جن کا کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ میں ذکر نہیں۔ گویا فقہ کے اصل مآخذ ''کتاب وسنت'' ہی ہیں اور اجماع وقیاس میں بھی بالواسطہ کتاب وسنت ہی کی اطاعت وفرماں برداری ہے، اس کے علاوہ فقہ کے جن دوسرے مصادر آثارِ صحابہؓ، استحسان، مصالحِ مرسلہ، استصحاب، عرف وعدات، شرائع ما قبل، سد ذرائع کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ سب بالواسطہ کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور قیاس ہی میں داخل ہیں اور اصولِ فقہ میں اس نکتہ کو بار بار واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کی حیثیت کتاب وسنت کی طرح مستقل نہیں ہے اور نہ یہ نصوص سے آزاد ہیں۔

جہاں تک اجنبی ذریعہ سے قانون سازی کی بات ہے تو ان میں سے صرف امم سابقہ کی شریعت ہے، جس کو کسی درجہ میں اس زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے لیکن شرائع ما قبل سے مراد پہلی آسمانی کتابوں کے وہ احکام ہیں جن کو قرآن مجید نے منسوخ نہیں کیا ہے، یہ احکام کسی دوسری قوم کے عرف ورواج اور سماجی اطوار پر مبنی نہیں ہیں بلکہ وحی الٰہی پر مبنی ہیں اور اس طرح کتاب اللہ کا ایک حصہ ہے، تاہم فقہائے اسلام نے مجرد ان کتابوں پر اعتماد کر کے کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم نہیں کی ہے؛ بلکہ کتاب وسنت میں امم سابقہ جن احکام کی تصدیق کی گئی ہے اور امتِ محمدیہ میں ان کے باقی رہنے کا اشارہ کیا گیا ہے انہیں کو قابل عمل تسلیم کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ایک اجماعی حکم ''قانونِ قصاص'' کا ہے جس کا خود قرآنِ پاک نے ذکر کیا ہے، ممکن ہے اس طرح کا ایک آدھ حکم اور بھی مل جائے، ظاہر ہے اس کو اسلامی فقہ میں اجنبی اثر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کے دوسری اقوام سے تشبیہ کو ناپسند فرمایا ہے اور اعتقادات وعبادات کے علاوہ تہذیب ومعاشرت میں بھی ان کی مشابہت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، اس لیے فقہائے اسلام نے بھی قدم قدم پر اس کو ملحوظ رکھا ہے اور ان احکام کو بھی جن کے بارے میں کتاب وسنت کی ہدایات واضح نہیں ہیں، اجنبی اثر سے آزاد رکھا ہے، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (۷۲۸ھ) نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب ''اقتضاء الصراط المستقیم'' تالیف فرمائی ہے۔ فقہ حنفی اس باب میں زیادہ حساس ہے، غالباً اس لیے کہ ایران اور مشرق کے علاقہ میں اس فقہ کی نشر واشاعت کی وجہ سے فقہائے احناف غیر مسلموں کے شعار اور ان کی تہذیب واطوار سے زیادہ واقف تھے۔

* رومی قانون کے مآخذ سے تقابل:

اب ایک موازنہ فقہ اسلامی کے ان مآخذ اور رومن لا کے مآخذ (Sourcees) کے درمیان کرنا چاہیئے کہ اس سے مسئلہ زیر بحث کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ بنیادی طور پر رومی قوانین دو طرح کے ہیں، ایک مکتوبی اور دوسرے غیر مکتوبی، مکتوبی سے مراد سرکاری قوانین ہیں اور غیر مکتوبی سے مراد وہ قوانین ہیں جو عوام کے رسم ورواج کی وجہ سے ازخود قانون کا درجہ حاصل کر گئے ہیں، گیس (Gaius) کے بقول مکتوبی قانون کے چھ مآخذ ہیں:

(۱) قانون موضوعہ اعلیٰ ترین (Leges) یعنی شاہان قدیم شرفاء روما کی مجلسِ عشریہ، غیر رومی باشندوں کی مجلسِ مأۃ وغیرہ کے طئے کئے ہوئے قوانین۔

(۲) قانون موضوعہ مجلس عوام

(۳) سینٹ کی تجاویز

(۴) فرامینِ شاہی

(۵) مجسٹریٹ کے اعلانات۔

(۶) مذہبی راہبوں کے فتاویٰ اور دوسرے قانون دانوں کی توضیحات۔

(ملاحظہ ہو، احمد عبداللہ المسدوسی کی کتاب، قانونِ روما برائے ایل، ایل، بی ۱۷۔۱۲)

اب غور کیجیے کہ "قانونِ مکتوبی" کے ان تمام مآخذ میں انسان کو اصل واضع قانون اور اس کے فہم واختیار اور حکم وفیصلہ کو قانون کی اساس مانا گیا ہے۔ کہیں یہ حیثیت بادشاہ کو حاصل ہے، کہیں قاضی کو، کبھی شرفاء روم کی جماعت دہگانہ کو، کبھی اہل روم کے ساتھ دوسری اقوام کے صدر ایوان کو، کہیں مجلس عوام اور مذہبی یا قانونی علماء کو ــــــ مگر اسلامی قانون کا تصور اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں قانون کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے "أَلَا لَهُ الْحُكْمُ" (الأنعام: ۶۲) اور اسی کے ہاتھ فیصلوں کی زمام ہے۔ "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ" (یوسف: ۴۰) ہی مسلمانوں کے تمام مکاتب فقہ کا مزاج ومذاق ہے، رومی نظامِ قانون میں رائے ایک قابلِ تحسین بات اور مفخرہ ہے اور فقہاء اسلام کے ہاں خود رائی ایک تہمت اور عیب ہے جس کی طرف اس کی صحیح یا غلط نسبت کر دی جاتی ہے، وہ اس سے بصد تاکید انکار ومعذرت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں فقہاء کے ہاں کثرت سے کتاب وسنت پر انحصار، اس کی بالادستی اور اس کے مقابلہ "رائے" کی مذمت اور اس کی بے اعتباری کے اقوال ملتے ہیں۔ (المیزان الکبریٰ کا ابتدائی حصہ دیکھا جائے)

خلاصہ یہ کہ فقہ اسلامی کی اپنی مستقل بنیادیں ہیں اور اس کا غالب حصہ کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، جو تھوڑے سے احکام نصوص سے صراحۃً یا اشارۃً ثابت نہیں وہ بھی ایسے قیاس پر مبنی ہیں کہ جن کی جڑیں کتاب وسنت میں پیوست ہیں۔

: فقہ اسلامی اور رومن لاء کا تعلق - تاریخی قرائن

تاریخ اسلام و تاریخ فقہ کا ادنی طالب علم بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ جب تک پیغمبرِ اسلام ﷺ اس دنیا میں جلوہ افروز رہے اس وقت تک ہر مسئلہ کا فیصلہ وحی الٰہی کی روشنی میں دربارِ رسالت سے ہوتا تھا، جب آپ ﷺ کی ذات بابرکت سے دنیا محروم ہو گئی اور یکے بعد دیگرے مسلسل فتوحات کے نتیجے میں مسلمانوں کو بیشمار نئے مسائل کا سامنا ہوا تو خلفاء راشدینؓ نے ان مسائل کے حل کے لیے مدینۃ المنورہ میں جہاں رومن لاء کے اثرات کی پرچھائیاں بھی نہیں تھیں' اہلِ فقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت تشکیل دی، جب بھی کوئی نیا مسئلہ کسی ملک میں پیش آتا اور قرآن وحدیث میں اس کا صریح حکم نہ ملتا تو وہ دربارِ خلافت مدینہ منورہ لکھ کر بھیج دیا جاتا خلفاء راشدین کے انفرادی اجتہاد یا فقہاء کی اجتماعی رائے سے اس مسئلہ کا فیصلہ کیا جاتا۔ اس طرح فقہ اسلامی کے چار ماخذ و سرچشمے قرار پائے۔ (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) اجماع (۴) قیاس واجتہاد۔ جن میں سے تین کی طرف نبی کریم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں صراحت کے ساتھ رہنمائی فرمادی تھی جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے، خلفاء راشدینؓ نے اپنے عہد زریں میں قانون سازی کے معاملہ میں انہی چاروں اصول کی پیروی کی اور فقہ اسلامی کا ایک بڑا حصہ اسی عہد کے فیصلوں پر مشتمل ہے، عہدِ صحابہؓ کے اختتام پر مدینہ منورہ ہی میں تابعین میں سے فقہاء سبعہ کی ایک جماعت موجود تھی جو قرآن وحدیث اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے پیش آمدہ مسائل کو حل کرتی تھی اور ان کے فیصلوں کا فقہ اسلامی میں اعتبار کیا جاتا تھا، ان فقہاء سبعہ میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے رومی قانون کی تعلیم حاصل کی یا کسی رومی کتاب کا مطالعہ کیا تھا، جب دوسری صدی میں مذاہب اربعہ کا ظہور ہوا تو کتاب وسنت کے بعد ان کا سب سے بڑا ماخذ یہی فیصلے تھے۔

:اسی کے ساتھ ایک نگاہ اولین مکاتب فقہ پر بھی ڈال لیجئے، عقیدہ اہلِ سنت کے مطابق جن میں حق منحصر ہے

: فقہ حنفی (۱)

یہ اکثر مسلمانوں کا فقہ ہے امام ابو حنیفہؒ (۸۰-۱۵۰ھ) کی طرف منسوب ہے، آپ کی پوری زندگی کوفہ، مکہ، بغداد کے ان علاقوں میں گذری جہاں رومی قوانین کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور نہ اس دور میں کسی رومی کتاب کا عربی یا فارسی میں ترجمہ ہوا تھا، خود امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی نہ رومی زبان سے

واقف تھے، نہ شام و فلسطین کے ایسے علاقوں سے آپ کا تعلق رہا جو پہلے رومی سلطنت کا حصہ تھے اور یہ تو بہت قدیم عہد ہے، اس صدی سے پہلے تک عربی زبان میں رومی قوانین کے ترجمہ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

تدوین فقہ یا اسلامی قانون سازی کے بارے میں آپؒ نے کن ماخذ و مصادر سے استفادہ کیا اور اس میں آپ کا طریقۂ کار کیا تھا آپؒ خود بیان فرماتے ہیں: ''میں کتاب اللہ کو لیتا ہوں؛ اگر اس میں حکم نہیں پاتا تو سنتِ رسولؐ کو لیتا ہوں اور جب معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرینؒ وغیرہ تک پہنچتا ہے تو جیسے انہوں نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں''۔(المیزان الکبری: ۱/۲) پھر فقہ حنفی تنہا آپ کی محنتوں کا نتیجہ نہیں بلکہ چالیس ائمہ اسلام کے علم و فہم کا عطر مجموعہ ہے، ان میں بڑے بڑے ائمہ حدیث اور ماہرین لغت عربی تھے، ایسے بھی تھے جو تفسیر و فقہ میں امام مانے جاتے تھے لیکن ایسا ایک شخص بھی وہاں نظر نہیں آتا جس نے رومی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی ہو یا رومی قوانین سے متاثر ہو۔

پس امام ابو حنیفہؒ رومی زبان سے واقف تھے، نہ رومی قانون کا لٹریچر عربی میں منتقل ہوا تھا اور نہ روم کی سابق ریاستوں سے آپ کا وطنی، تجارتی یا علمی علاقہ تھا، اس لیے تاریخی اعتبار سے کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جو امام ابو حنیفہؒ اور فقہ حنفی کے رومی قوانین سے تاثر اور استفادہ کو کسی درجہ میں بھی ظاہر کرتا ہو۔

فقہ مالکی و شافعی وغیرہ (۲)

یہ امام دار الھجرت مالک بن انسؒ کی طرف منسوب ہے، آپ کی پوری عمر مدینۃ النبی ﷺ ہی میں گذری، اس ڈر سے کہ مبادا مدینہ منورہ سے باہر موت نہ آجائے، آپؒ نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا، آپؒ کے نزدیک کتاب وسنت کے بعد اہلِ مدینہ کا عمل بھی حجت ہے، بے ضرورت قیاس کو آپؒ سخت ناپسند فرماتے تھے، اس لیے آپ کے مذہب میں قیاس بہت کم پایا جاتا ہے، تقریباً یہی حال امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے فقہ کا ہے، ان میں سے کسی نے کبھی کسی رومی علاقہ کا سفر کیا نہ کسی رومی کتاب کا مطالعہ کیا بلکہ خالص کتاب وسنت، اجماع و قیاس ابتداء سے انتہا تک ان کا مرجع وماخذ ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ فقہ اسلامی اور خصوصاً فقہ حنفی رومن لاء سے ماخوذ ہے، آفتاب کے نور کو چھپانے کی ایک ناکام کوشش ہے۔

☆ قانون روما سے فقہاء کی بے اعتنائی :

فقہ اسلامی اور قانون روما کے موازنے پر یہ اشارات جو ذرا طویل ہو گئے، یہ واضع کرنے کے لیئے کافی ہیں کہ فقہ اسلامی ایک مستقل بالذات نظام قانون ہے، جو اپنے توسیع وار تقاء میں کسی طرح بھی قانون روما کا مرہون منت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ وتذکرہ کی کسی بھی قدیم کتاب میں اس امر کا ادنی سا بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ کسی فقیہ یا غیر فقیہ مصنف نے رومی یا بازنطینی قوانین سے دلچسپی لی ہو، ان کا مطالعہ کیا ہو یا ان سے جزوی واقفیت حاصل کی ہو۔ مزید براں اکثر فقہی مذاہب ومسالک کا ظہور کوفہ، بصرہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ یا آگے چل کر بغداد میں ہوا جو خالص اسلامی آبادیاں تھیں۔ ان اسلامی بستیوں میں نہ رومی اثرات پائے جاسکتے تھے نہ بازنطینی۔ آخر مدینہ منورہ میں امام مالک اور ان کے اساتذہ امام نافع اور ابوالزناد نے کس طرح اور کن ذرائع سے قانون روما کے تصورات سے واقفیت حاصل کی؟ امام شافعی نے مکہ مکرمہ میں جب ان کی فقہی بصیرت کی تشکیل ہو رہی تھی کیونکر قانون روما تک رسائی حاصل کی؟ یہی سوال بقیہ فقہاء اور مجتہدین کے بارے میں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فقہ حنفیہ کا بیشتر ارتقاء ماوراء النہر اور عراق عجم کے علاقوں میں ہوا جو رومی اثرات سے باہر تھے۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ نہ صرف فقہ اسلامی کے تشکیلی دور، یعنی ابتدائی چار ہجری صدیوں میں، بلکہ بعد میں کم وپیش مزید آٹھ سو سال تک مسلمانوں نے قانون کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ نہیں کیا۔ نہ صرف رومن زبان سے بلکہ مغرب ومشرق کی کسی زبان سے بھی قانون کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ اگر آپ نے اسلام کی تاریخ میں یونانیوں کے علوم وفنون کے ترجمہ کی تفصیل پڑھی ہو تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ مسلمانوں نے یونانیوں کے علوم وفنون کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ افلاطون اور ارسطو کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ سقراط، بقراط اور حکیم جالینوس کی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ منطق، فلسفہ اور طب پر سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں کتابیں مختلف زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ قانون یا دستور کے موضوع پر کوئی بھی کتاب عربی میں ترجمہ ہوئی ہو۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر گیارہویں بارہویں صدی ہجری تک کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ قانون کی کوئی کتاب عربی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام کا قانون اور فقہ اتنا منظّم اور اتنا مرتب تھا کہ مسلمانوں نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ ان کو کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جو قانون کے میدان سے تعلق رکھتی ہو اور دنیا کی کسی دوسری قوم کے پاس موجود ہو۔

:اس دعویٰ کی حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے مشہور محقق عالم دین ڈاکٹر حمید اللہ تحریر فرماتے ہیں

میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کم از کم ابتدائی فقہی کتابوں کی ترتیب ہی قانون روما کے مماثل ہو، قانون روما زمانہ قبل مسیح ہی سے عبادات ’’ کو معاملات سے الگ کر چکا تھا اور دنیوی معاملات کا قانون، اشخاص، اشیاء اور ضابطہ کے تین حصوں میں تقسیم ہوتا تھا، جب کہ فقہ حنفی کی ترتیب عبادات، معاملات اور جنایات کے تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی، جس میں قواعدِ عمومی یعنی دستور اور احکامِ مملکت بھی شامل تھے اور ان کی یہ ترتیب رومی قانون کی ترتیب سے بنیادی اختلاف رکھتی ہے، فقہ حنفی کا زمانہ بنوامیہ کے آخری اور بنوعباس کے ابتدائی دور پر مشتمل تھا اور ابھی یونانی علوم وفنون کا زیادہ ترجمہ اور

رواج نہیں ہوا تھا؛ پھر جو کچھ بھی اس وقت ترجمہ ہوا تھا اس سے چند فنی اصطلاحیں منطق، فلسفہ، طب و نجوم، کلام و جغرافیہ وغیرہ میں اگرچہ مدد لی گئی تھی؛ لیکن اصولِ فقہ میں کوئی معرب اصطلاح نہیں ملتی، اس کے جتنے بھی الفاظ ہیں وہ قدیم عربی ہی کے مروج الفاظ ہیں اور اکثر قرآنی الفاظ ہیں، امام مالکؒ نے مؤطا کے ابواب کی جو ترتیب رکھی ہے وہ امام ابو حنیفہؒ کی ترتیب سے مختلف ہے اور عبادات و معاملات سب خلط ملط ہیں، ان دو ہمعصر فقہاء کی تالیفوں میں ابواب کی ترتیب میں بے انتہاء اختلاف بتاتا ہے کہ ترتیب میں بھی ان کے سامنے کوئی بیرونی نمونہ نہ تھا اور ہر کوئی اپنی ذہنی جولانی سے اپنے لیے کوئی خاکہ پسند کر رہا تھا، امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ کا زمانہ نسبتاً بعد کا ہے (لیکن ان کی کتابیں بھی بیرونی نمونہ سے بالکل آزاد ہیں) اس کے علاوہ فقہ اسلام اور قانونِ روما میں مسائل کے لحاظ سے بھی غیر معمولی فرق ہے، عبادات، تعزیرات، مالیات، قرض و سود، وراثت، نکاح و طلاق، نسب، خلع، غلاموں کی آزادی، عدل گستری، قانون بین الممالک وغیرہ میں دونوں کے درمیان کوئی مماثلت ہی نہیں ہے"۔ (خلاصہ چراغِ راہ: ۱/۲۲۸،۲۲۹)

رہا مستشرقین کا یہ مفروضہ کہ عربی اسلامی فتوحات کے بعد بھی ایک صدی تک رومی علاقوں میں قدیم رومی نظام ہی جاری رہا اور اس کے مطابق رعایا کے فیصلے ہوتے رہے، کیا عجب ہے کہ فاتحینِ اسلام نے قانون سازی کے معاملہ میں اس سے استفادہ کیا ہوگا یا کم از کم اسکندریہ و بیروت کے قانون کی تعلیم کے مشہور مدارس ہی کی روایات جاری رہی ہوں گی تو یہ ان کا خیال ہی خیال ہے، جس میں سچائی اور حقیقت کی کچھ بھی آمیزش نہیں ہے۔ بفرض محال اگر اس بات کو تسلیم بھی کرلیں کہ عربی فتوحات کے بعد بھی وہاں ایک صدی تک سابقہ قوانین نافذ رہے، تب بھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں نے اس سے علمی استفادہ کیا ہوگا، مسلمان تو خود ایسے زرین اصول و قوانین اور جامع شریعت مدینۃ المنورہ سے ساتھ لیکر ہر جگہ بانٹتے ہوئے روم کی سرحدوں تک آئے تھے جس کی فضیلت و برتری کا کھلا اعتراف ایک مستشرق کے قلم نے ان الفاظ میں کیا ہے: "اسلامی قانون کا نظام اپنی داخلی خصوصیات کے لحاظ سے ہی ہے، ماہرین کی نظروں میں وہ تعریف و تحسین کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، اپنے ہم عصر ابتدائی جاگیری قوانین کے بے ڈھنگ رسوم اور وحشیانہ رواجوں پر وہ بے حد فضیلت رکھتا ہے"۔ (چراغِ راہ: ۱/۱۹۰)